ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش

اسسٹنٹ پروفیسر اردو،

گورنمنٹ پریمیئر ڈگری کالج نارتھ ناظم آباد، بلاک ایچ، کراچی

سندھ کے مشائخِ چشت کی سوانح نگاری

(محرکات، اسلوب اور تجزیہ)

Monastic thoughts of "Chishtias" are famous in the subcontinent for centuries. Patriarchs of "Chishtias" have played a pivotal role in spreading the monastic literature in the subcontinent. There are a lot of Urdu biographies are available in the thesaurus of monastic literature in Sindh. Like other kinds of monastic literature, the Patriarchs of "Chishtias" have also written many biographies. In this article, those biographies are discussed which were related to "Chishtias Chain" of Sindh. Main objectives of discussion biographies are Love, strong attachment with their patriarchs and to preserve the life history of their "Sheikhs". Although the writers have not adopted the technical method of writing biography but the fact is that they are still beneficial and helpful to the people, especially for those who attached themselves with the Monastic System. Monastrial biographies are neglected in the history of Urdu literature. Keeping their importance in view, they should be given their due place in the History of Urdu literature.

Key words: Monastic Literature,PatriarchsChishti Sindh،biographies

کلیدی الفاظ: (۱) سندھ (۲) شیخ، مشائخ (۳) سوانح (۴) چشت (۵) خانقاہی ادب (۶) تصوّف

سوانح یا خودنوشت نثری ادب کی وہ صنف ہے جس میں کسی فرد کے حالاتِ زندگی اور تجربات ضبطِ تحریر میں لائے جاتے ہیں۔ رفیع الدین ہاشمی کے خیال میں یہ کوئی مستقل صنفِ ادب نہیں ہے، بلکہ مقالہ نویسی ہی کی ایک شکل یا قسم ہے۔[۱] رفیع الدین ہاشمی کے اس خیال سے اختلاف کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اردو ادب میں حالؔی کی تحریر کردہ سوانح عمریوں کے بعد، یہ ایک باقاعدہ صنف کے طور پر جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ اس کا اعتراف ڈاکٹر یونس حسنی نے یوں کیا ہے کہ ''اِسے [سوانح نگاری کو] باقاعدہ فن کی صورت میں رائج کرنا حالی کا کارنامہ ہے۔''[۲] یہی نہیں سوانح نگاری کے فن پر تحقیقی مقالات بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں الطاف فاطمہ کی کتاب ''اردو میں سوانح نگاری کا فن'' اہم ہیں۔ سوانح نگاری کو اس لیے بھی

مقالہ نویسی کہنا درست نہیں ہے کہ اِن دونوں کے اصول بھی علاحدہ ہیں۔ سوانح نگاری کے دو اہم اصول درج ذیل ہیں۔

(۱) سوانح نگار کا اُس فرد سے جس کی سوانح لکھنا مقصود ہو، اُس سے تعلقِ خاطر اور دل چسپی ضروری ہے کیوں کہ اگر یہ نہ ہو تو وہ حالات و واقعات معلوم کرنے میں محنت اور جستجو سے کام نہیں لے سکے گا۔ جس کے نتیجے میں حقائق اُس سے قلم بند نہیں ہو سکیں گے۔

(۲) سوانح نگار کا شخصیت سے جذباتی لگاؤ، تحقیقی ذوق اور تنقیدی شعور سوانح کو معیاری اور بلند پایہ بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔[۳]

اردو ادب میں جو ابتدائی سوانح عمریاں تحریر کی گئیں، اُن کا ایک مقصد زوال پذیر قوم کو اپنے قابلِ فخر رہنماؤں کے کارناموں سے آگاہی دے کر ان میں جوش و خروش اور ملّت کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ گویا ان کا ایک اہم مقصد قوم کی اصلاح تھا۔ خانقاہی ادب میں بھی سوانح نگاری کے مقاصد میں اصلاحی، اخلاقی اور روحانی تربیت شامل ہیں۔ ہمارے زیر بحث مقالے میں سلسلۂ چشت بالخصوص سندھ سے وابستہ مشائخ کی سوانح نگاری اور سوانح عمریوں کے محرکات، اسلوب اور لوازمے کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

شاہ آغا محمدؒ کے حالاتِ زندگی کو شاہ میرزا نذیر احمد نیازیؒ نے ''تذکرہ حضرت شاہ آغا محمدؒ'' کے عنوان سے قلم بند کیے ہیں۔ یہ تذکرہ قیامِ پاکستان سے قبل لکھا گیا تھا مگر اس کا اصل مسوّدہ چوری ہو گیا۔ پھر کچھ مسوّدہ مِلا، جس میں ترمیم و اضافہ صاحبِ تذکرہ کے فرزند ارجمند میرزا مصطفیٰ حسین اور نبیرۂ صاحبِ تذکرہ ڈاکٹر میرزا اختیار حسین نے کیا۔ بالخصوص ڈاکٹر میرزا اختیار حسین نے موقع بہ موقع کتاب میں حاشیے اور وضاحتیں تحریر کی ہیں۔ سوانح سے قبل ڈاکٹر میرزا اختیار حسین کیف نیازی کا تحریر کردہ ایک مقدمہ اور دیباچہ بھی شامل ہے۔ ''مقدمہ'' تصوُّف کی تعریف، اس کی اہم اصطلاحوں، تصوّف پر اعتراضات اور ان کے جوابات پر مشتمل ہے۔ جب کہ دیباچے میں اولیائے کرامؒ اور شاہ آغا محمدؒ کے کردار اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ زیرِ بحث تذکرے کے بارے میں معلومات بھی دیباچے میں درج ہیں۔

حالاتِ زندگی میں سنِ پیدائش نہیں دیا گیا اور نہ ہی اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی۔ صرف اس قدر لکھا ہے کہ ''آپؒ باعتبار واقعات بحساب سنِ ہجری دنیا میں ۸۶، ۸۷ برس رونق افروز رہے۔ ۱۳۳۴ھ میں واصل الی اللہ ہوئے۔''[۴] جب کہ صفحہ نمبر ۳۷ پر تحریر ہے کہ اُن کا وصال ۱۹۱۸ء میں ہُوا۔ تقویمِ تاریخی کے مطابق ۱۳۳۴ھ میں دو ماہ ۱۹۱۵ء اور باقی ۱۰ ماہ ۱۹۱۶ء کے ہیں۔ ویب سائٹ www.agharang.org اور کتاب میں وصال ۱۳، ذی القعدہ ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۷، اگست ۱۹۱۸ء درج ہے۔[۵] ہجری اور عیسوی سنین میں مطابقت نہیں ہے۔ ہجری سال کے حساب سے اُن کا سنِ وصال ۱۱ یا ۱۲ ستمبر ۱۹۱۶ء بنتا ہے، نہ کہ ۱۷، اگست ۱۹۱۸ء۔ اس حساب سے سنِ پیدائش ۱۲۴۸ھ یا ۱۲۴۷ھ ہو سکتا ہے۔ پوری کتاب

میں سنین جیسے اہم پہلو سے اعراض برتا گیا ہے۔ یہی نہیں ویب سائٹ پر بھی جو حالاتِ زندگی دیے ہیں، ان میں بھی سنین نہیں دیے گئے ہیں۔ بزرگوں کے بارے میں درست معلومات کی فراہمی اور حالاتِ زندگی آنے والی نسلوں کی رہنمائی کا اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس کی سب سے بہ ترصورت تو یہ ہے کہ بزرگ اپنے حالاتِ زندگی خود ہی قلم بند کر دیں۔ بصورتِ دیگر کم از کم اپنی زندگی ہی میں اِسے قلم بند کرا دیں۔ موجودہ رو بہ زوال اور منطقی عہد میں جب درست کوائف اور واقعات نہیں ملتے تو ماضی کے بزرگوں کے غیر منطقی اور غیر مصدقہ حالات پر اعتراض ہوتے ہیں۔ راقم کی رائے کے برخلاف یہ نقطۂ نظر بھی جنم لیتا ہے کہ حالاتِ زندگی خود تحریر کرنے یا تحریر کرانے سے اس سے نمود و نمائش کا پہلو نکلتا ہے۔ اس نقطۂ اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اہلِ تصوُّف اس بات کو بہتر جانتے ہیں کہ ہر عمل کا دارومدار نیّت پر ہوتا ہے۔ جب وہ خود حالات قلم بند کریں یا کرائیں گے تو یقیناً اس میں اعتدال اور سچائی بھی ہوگی۔ یہ سچّائی راہِ سلوک کے مسافروں کے لیے راہ نمائی کا ذریعہ بنے گی جو بزرگوں کی زندگی کا ایک اہم مقصود رہا ہے۔

اس سوانح میں شاہ آغا محمدؒ کی زندگی کے بارے میں معلومات کم اور واقعات زیادہ بیان کیے گئے ہیں۔ جن پر خانقاہی رنگ چڑھا ہُوا ہے۔ یہ واقعات بچپن سے لے کر اخیر دم تک کے ہیں جو پُر تاثیر ہیں۔ ان واقعات سے قاری کو نصیحت حاصل ہوتی ہے۔ بزرگوں کی سوانح کا اصل مطمحِ نظر بھی یہی ہوتا ہے کہ ان کے حالات کے مطالعے سے قلوب کو گرمی اور نرمی حاصل ہو۔ صاحبِ تذکرہ کے فرزندِ اصغر میرزا مصطفیٰ حسینؒ کا تحریر کردہ ضمیمہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ جن کا وصال کراچی میں ہُوا۔ شاہ آغا محمدؒ کے وصال کے بارے میں معلومات اسی ضمیمے میں شامل ہیں۔ ان میں بھی میرزا اختیار حسین نے ترمیم و بہتری کی ہے۔ دوسرا ضمیمہ میرزا اختیار حسین کا تحریر کردہ ہے۔ جس میں اُن کے شجرۂ طریقت کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان سلاسل کا تذکرہ بھی کیا ہے، جن سے انھوں نے فیض پایا تھا۔

''تذکرہ حضرت شاہ آغا محمدؒ'' کے محرکات کا تذکرہ تو کہیں نہیں کیا گیا مگر دیباچے کی عبارت اور خانقاہی نظام سے وابستہ افراد کی تحریر کا بنیادی مقصد اصلاحِ افراد ہے جو واقعات سوانح میں بیان کیے گئے ہیں، ان میں بھی اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔ ان سے ایمانِ کامل، درویشی اور توکل کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

''تذکرہ حضرت شاہ آغا محمدؒ'' کا اسلوب بہت پُر اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح پُر تعیش زندگی گزار کر فقیری اختیار کی۔ مصائب کا صبر و عزم سے مقابلہ کیا اور یہ سب پریشانیاں اور دکھ اللہ کی راہ اٹھائے۔ جس کی وجہ سے ان کے دل میں اللہ اور اس کی مخلوق سے محبت پیدا ہوگئی۔ دل گداز ہوگیا اور اس کی تاثیر اسلوب میں آ گئی۔ اسلوب کا انداز بیانیہ ہے۔ جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، وہ عمومی زندگی سے متعلق ہیں۔ مگر کچھ الفاظ پرانے معنوں میں بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ اب وہ اِن معنوں میں مستعمل نہیں ہیں۔ جیسا کہ مثالِ اسلوب میں گروہ یا قبیلے کے لیے ''فرقے'' کا استعمال اور ''راستہ چھوڑ کر آزو باز و میدان میں ہو جاتے''[۶] موقع بہ موقع اردو اور فارسی اشعار کا استعمال کیا گیا

ہے۔اسلوب دیکھیے۔

''امراً سے جیسا واسطہ اور ارتباط تھا، عموماً اس شہر کے لوگ جانتے تھے۔نہ دعوتوں میں اور نہ مراسمِ دنیا میں شریک ہوتے تھے۔ملاقات بھی اگر کسی سے ہوگئی تو غنیمت تھا۔خود کسی سے ملنے کی کوشش نہ کرتے تھے اور نہ خواہش۔کہیں برسرِ راہ ملاقات ہوگئی تو ہوگئی مگر غریبوں سے، وہ انس تھا کہ دیکھنے والے حیرت کرتے تھے۔جبل پور میں ایک ستارسازوں کا فرقہ تھا جو پُتلی والوں کے نام سے مشہور تھا۔وہ لوگ بہت غریب اور سادہ لوح تھے۔تقریباً سب لوگ حضرت صاحبؒ سے بیعت تھے۔۔۔۔جیسا کہ عرض کیا گیا یہ فرقہ نہایت غریب اور سادہ لوح لیکن بہت خوش عقیدہ تھا، ان میں سے ایک مرید لعل خاں کو آپ نے ایک مرتبہ بہت پریشان دیکھا۔استفسارِ حال فرمایا، اُنھوں نے اپنی حالت اور عسرت کی شکایت کی، آپ بہت متاثر ہوئے اور ایک اسم ان کے ذہن کے مطابق یاد کرایا اور اس کی ترکیب سمجھادی کہ اسے اس طرح پڑھتے رہو، چناں چہ لعل خاں صاحب کچھ دنوں بعد کافی خوش حال ہوگئے۔''[۷]

''تذکرہ حضرت شاہ آغا محمدؒ'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں اور دوسرا ۲۰۰۴ء میں جماعت السالکین، خانقاہ آغائیہ مرتضویہ ٹرسٹ کراچی نے شائع کیا۔

سید شریف الحسن کی مرتب کردہ ''سیرتِ ذوقی'' شاہ سید محمد ذوقیؒ کی سوانح حیات ہے۔یہ کتاب ''تربیۃ العشاق'' میں صفحہ ۴۲۹ تا ۵۰۳ کل ۷۴ صفحات پر مشتمل ہے۔یہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ایک حصّہ اُن کی شخصیت، کردار اور صفات و عادات پر مشتمل ہے، جب کہ دوسرا حصّہ واقعاتِ زندگی پر مبنی ہے۔عموماً سوانح حیات میں واقعاتِ زندگی کو آغاز میں دیا جاتا ہے، بعد ازاں شخصیت و سیرت پر بحث کی جاتی ہے۔اس کے برعکس ''سیرتِ ذوقی'' میں سیرت کو پہلے اور حالاتِ زندگی کو بعد میں پیش کیا گیا ہے۔

شاہ سید محمد ذوقیؒ کی سیرت میں جن پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے، اُن میں آپ کا حلیہ بھی شامل ہے۔اس سے قبل ایک حدیث درج کی ہے۔جس کا ترجمہ ہے کہ ''وہ، وہ لوگ ہیں، جن کے دیکھنے سے خدا یاد آجاتا ہے۔'' پھر خانقاہی نظام کی ایک کم زوری کی طرف لطیف سا اشارہ کر کے اُن کا سراپا بیان کیا ہے۔عموماً خانقاہوں میں مشائخ سے ملنے جائیں تو اُن کے مریدین شیخ کی تعریف میں وہ کچھ بیان کر دیتے ہیں، جسے سُن کر شیخ بھی شرما جائے۔بقول ایک شیخ ''مرشد خود نہیں اُڑتا، اُسے اس کے مریدین ہَوا میں اڑاتے ہیں۔'' سید شریف الحسن کے بقول شاہ سید محمد ذوقیؒ کے گرد اِس قسم کا کوئی حلقہ نہیں تھا۔ممدوح کا سراپا مصنف نے اس خوب صورتی سے کھینچا ہے کہ ان کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔شخصیت کے دیگر پہلوؤں میں لباس، نظریۂ تصوُّف، مسلک اور دیگر روحانی معاملات کو پیش کیا گیا ہے۔بعد ازاں عادات و خصائل میں غصّہ، حِلم، نفاست، صفائی، خوراک، سونا اور آرام، خوش طبعی، حافظہ، موسیقی سے لگاو، سیاسی مسلک اور موجودہ ترقی کے

بارے میں نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے۔ آخری الذّکر کو موجود حالات کے پیش نظر دیکھا جائے تو زندگی، ترقی اور دنیا کے بارے میں درست رائے قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ان کا سیاسی نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ مِل کر کام نہیں کیا جائے۔ دیگر علمائے کرام کے برعکس وہ سرسید کی تعریف کرتے تھے کہ انھوں نے مسلمانوں کو الگ راستہ دکھایا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا اپنا سیاسی ادارہ ہونا چاہیے۔(۸) سائنسی ترقی کے بارے میں وہ یہ نقطۂ نظر رکھتے تھے کہ لوگ اشیا کے غلام ہو رہے ہیں اور یہ رویّہ انسان کو انسانیت سے دور کر رہا ہے۔ اگر ہم اپنے حقیقی مقصدِ حیات کو پیش نظر رکھ کر، اِن اشیا سے استفادہ کریں تو اس سے وقت کی جو بچت ہوگی، اسے اللہ کے کاموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔[9] اسی طرح انھیں اردو زبان پر عبور تھا۔ اس حوالے سے ایک واقعہ بھی درج کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ چند دوستوں، جن میں جسٹس شاہ دین اور ڈاکٹر اقبال بھی شامل تھے، ان کے درمیان یہ طے ہُوا کہ جو کوئی اردو لفظ کی جگہ کسی اور زبان کا لفظ استعمال کرے گا، اُس پر ایک پیسہ جرمانہ ہوگا، ان پر کبھی جرمانہ نہیں ہُوا۔ ایک مرتبہ انھیں ''ریل کا سفر'' پر مضمون اس نیت سے لکھنے کے لیے دیا کہ اب کس طرح جرمانے سے بچیں گے، مگر انھوں نے ریل کے لیے دخانی گاڑی، ٹکٹ کے لیے پروانہ راہ داری اور اسٹیشن کے لیے اڈّے کا لفظ استعمال کر کے، یہ مرحلہ بھی طے کر لیا۔[10]

مصنف نے واقعاتِ زندگی کے بیان میں بھی ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔ پہلے ممدوح کے جدِّ امجد کے بارے میں بیان کیا پھر ان کے والد سید ابو جمال الدینؒ کے حالاتِ زندگی سے متعلق بنیادی معلومات اختصار سے فراہم کی ہیں۔ ان میں ولادت، تعلیم اور سرکاری ملازمت کی تفصیلات شامل ہیں۔ شاہ سید محمد ذوقیؒ کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، انھیں مختلف عنوانات دیے ہیں۔ یہ عنوانات فہرست میں شامل ہیں۔ جس سے قاری کی رسائی درکار معلومات تک بآسانی ہو جاتی ہے۔ حالاتِ زندگی میں صرف زندگی کے اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ جن میں اُن کی صحافتی کارناموں اور سیاسی سرگرمیوں کا بھی ذکر ہے۔

الغرض سید شریف الحسن کی ''سیرتِ ذوقی'' ذوقیؒ کی زندگی کے بارے میں نہ صرف معلومات فراہم کرتی ہے بلکہ اُن کی شخصیت کے بھی بیش تر پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس کے مطالعے سے سالکین استفادہ کر سکتے ہیں۔ نمونۂ نثر ملاحظہ کیجیے۔ جس میں ان کا سراپا بیان کیا گیا ہے۔

> ''بعض لوگوں کی شخصیت کو اُن کے پرستار بناتے ہیں اور جن لوگوں کا ان کے گرد حلقہ ہوتا ہے، وہ پہلے سے آنے والے کو ذہنی طور پر تیّار کر لیتے ہیں۔۔۔ شاہ صاحبؒ کے گرد اس قسم کا کوئی حلقہ نہ تھا لیکن اُن کا نورانی اور رعب دار چہرہ خود بتاتا تھا کہ وہ ایک بڑی ہستی ہیں۔۔۔ شاہ صاحب قبلہؒ میانہ قد کے تھے، اُن کا جسم بہت مضبوط اور گٹھا ہُوا تھا۔ اُن کا چہرہ سنجیدہ مگر شگفتہ تھا۔ پیشانی بڑی چوڑی اور کشادہ تھی اور اس پر لمبی لمبی شِکنیں غور و فکر کا پتا دیتی تھی۔ آپؒ کے سر پر بال بہت کم تھے، آپ کشادہ ابرو تھے بھنویں بہت گھنی اور لمبی

تھیں۔ آنکھیں سیاہ نہ تھیں، لیکن اُن سے ایک خاص قسم کی ذہانت ٹپکتی تھی۔۔۔ آپؒ کے رخسار بھرے بھرے اور اُبھرے ہوئے تھے۔ ناک بھی پُر گوشت تھی اور نتھنے بڑے بڑے تھے۔ آپؒ کی داڑھی گھنی اور گول تھی، [جو] بال اور بھنوؤں کی طرح بالکل سفید تھی۔ آپ کی انگلیاں بھی پُر گوشت تھی اور کسی قدر گاؤ دم تھیں، آپؒ کا تمام جسم نہایت سڈول اور خوب صورت تھا۔ سینہ خوب چکلا اور بھرا ہُوا تھا۔ تو ند تھی لیکن بدوضع اور باہر نکلی ہوئی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پیر آپ کے نسبتاً چھوٹے چھوٹے تھے۔ چلنے میں آپؒ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے تھے۔ آپؒ کی چال بہت سبک اور تیز تھی۔ فالج کے حملے سے قبل بالکل نوجوانوں کی طرح چلتے تھے اور بہت چلتے تھے۔'' ۱۱

''سیرتِ ذوقی'' کی پہلی اشاعت محفل ذوقیہ کراچی کے تحت ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ ہمارے پیش نظر طبع ششم ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء ہے۔

بابا ذہین شاہ تاجیؒ کا شمار، اُن صوفیاے کرام میں ہوتا ہے جو علمی حیثیت میں بھی ایک اعلا مقام رکھتے تھے۔ ابنِ عربی کی کتب کے تراجم اور رسالہ تاج کے خصوصی شمارے علمی، ادبی، سیاسی اور خانقاہی ادب کے حوالے سے اہم کارنامے ہیں۔ ذہین شاہ تاجیؒ کی تحریر کردہ ''تاج الاولیا'' آپ کے دادا مرشد سید محمد بابا تاج الدینؒ کی سوانح ہے۔ اس سوانح میں ڈاکٹر محمد محمود احمد کا مقدمے کے علاوہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد فاضل شمسی اور ڈاکٹر سید محمود کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ ان کے ساتھ مؤلفِ کتاب بابا ذہین شاہ تاجیؒ کی ایک تحریر ''اشارات'' کے عنوان سے کتاب کا حصّہ بنی ہے۔ جس میں تصوّف کی اصطلاحات کی تشریحات اور صوفیانہ پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند موضوعات یہ ہیں: عشقِ الٰہی عشقِ رسول ﷺ، اقسامِ ذکر الٰہی، مجاہدات اور ذکر وفکر کا دور، شق القمر وغیرہ۔ پھر ''صفاتِ جذب وسلوک'' کے عنوان میں اقسامِ ولایت، قطبِ زمانہ، کشف، جذب وسکر اور برزخ وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر محمد محمود احمد لکھتے ہیں کہ ''اس تذکرے سے پہلے بھی بابا صاحبؒ کے متعدد تذکرے لکھے جا چکے ہیں اور جو تذکرہ بھی لکھا گیا ہے، وہ حسنِ عقیدت کے ساتھ اور تلاش جستجو کے بعد ہی سپردِ قلم ہُوا ہے لیکن جس حسن وخوبی، تحقیق اور ذوق و عرفان کے ساتھ مولانا نے یہ تذکرہ تحریر فرمایا ہے اور جس برزخ میں یہ لکھا گیا ہے، وہ مولانا ممدوح کا ہی حصّہ ہے۔'' ۱۲

'تاج الاولیا'' کا بنیادی محرک مؤلف کی بابا تاج الدینؒ سے والہانہ عقیدت ہے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ سلسلۂ تاجیہ کی تاریخ کو محفوظ کرنا بھی رہا۔ اس میں بابا یوسف شاہ تاجیؒ کے وصال وتدفین سے لے کر خانقاہ کی تعمیر، سلسلہ میں پیدا ہونے والی بدگمانیوں کے ساتھ سلسلے کی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔ ''تاج الاولیا'' کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بابا تاج الدین اولیاؒ کے خلیفہ بابا یوسف شاہ تاجیؒ کی لکھی ہوئی ''مثنوی اسرارِ تاج'' بھی شامل کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں حمد و نعت، اوصاف ابوالبشر آدم علیہ السلام، ختم نبوت ﷺ، مناقب پنجتن پاکؓ وصحابہ کرامؓ کے بعد بابا تاج الدین اولیاؒ کے

حالات کو صنفِ مثنوی میں پیش کیا ہے۔ دو اشعار ''خدا کے دوست'' کے عنوان سے پیشِ خدمت ہیں۔

'' خدا کے دوستوں کی مرضی بھی حق کی مشیت ہے
ہمیں تو ان کے قدموں میں ہی بس حاصل بریّت ہے
خدا کے لطف کا بادل جہاں چاہے وہاں برسے
مشیت دیکھ لو اس کی کوئی پی لے کوئی ترسے''[۱۳]

'تاج الاولیا'' میں بابا تاج الدینؒ کے مفصّل حالاتِ زندگی کے ساتھ، ان کی کرامات کو تفصیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بیش تر کرامتی واقعات زندہ لوگوں کے بیان کردہ ہیں۔ اس میں اُن مسودات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو بابا یوسف شاہ تاجیؒ نے صاحبِ سوانح کے متعلق تحریر کیے تھے۔ اس کتاب کی اہم خصوصیت محبت و عقیدت کا پہلو ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی کتابت خود مؤلف نے کی تھی۔ یہ سوانح اس حوالے سے بھی انفرادیت کی حامل ہے کہ اس میں بابا تاج الدین اولیاؒ کے خلفا اور خاص مریدین کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اسی ضمن میں مؤلف نے اپنے مرشد بابا یوسف شاہ تاجیؒ کے حالاتِ زندگی بھی تحریر کیے ہیں۔ جس میں کشف و کرامات کا بڑا حصّہ ہے۔ اِن کے بھی خلفا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی افادیت میں اضافے کے لیے سید عبدالواحد کی دو تحریریں بھی شامل کی گئیں ہیں۔ ایک کا عنوان ''بارگاہ تاج اولیا میں علامہ اقبال کی عقیدت'' اور دوسرے کا ''سرتاجِ اولیا بابا تاج الدینؒ'' ہے۔ اول الذّکر میں علامہ اقبالؒ کے خطوط جو مہاراجہ شادؔ کو لکھے گئے تھے۔ ان کے اقتباس پیش کیے گئے ہیں۔ جن سے بابا تاج الدینؒ سے ان کی محبت اور عقیدت کا پتا چلتا ہے۔ ایک تحریر ''سیر نا گپور'' (اردو کا پہلا رپورتاژ) تحسین سروری کی بھی شامل ہے۔ جس میں مہاراجہ شادؔ کے سفر نامے کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اِس حوالے سے درج ذیل اقتباس اردو سفر نامے میں دل چسپی رکھنے والوں کے لیے اہمیت کا باعث ہوگا۔

'' اردو میں سفر ناموں کی کافی تعداد پائی جاتی ہے، بعض سفر ناموں کو بڑی اہمیت بھی حاصل ہے، لیکن مہاراجہ کشن پرشاد کے سفر نامے بھی اس قابل ہیں کہ وہ اردو کے معیاری سفر ناموں میں جگہ پا سکیں۔ مہاراجہ کے سفر نامے تاریخ کے ایک خاص ماحول کی سیر کراتے ہیں اور ساتھ ہی معلومات کا خزانہ بھی ہیں۔ یہی وہ سفر نامے ہیں، جن کے ذریعے ہم مہاراجہ شادؔ کے عقائد اور ان کے صلح کل مشرب سے واقف ہوتے ہیں۔''[۱۴]

'تاج الاولیا'' کی تاریخی اہمیت بھی ہے کہ اس میں بابا تاج الدین اولیاؒ کے حوالے سے ہندوستان میں پیش آنے والے کئی سیاسی واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ

قیامِ پاکستان کے بعد خانقاہ کی تعمیر کے سلسلے میں انتظامی حالات سے آگہی بھی اس سوانح سے حاصل ہوتی ہے۔سلسلے تاجیہ کے اختلافات کو بھی سوانح کا حصّہ بنایا گیا ہے۔خانقاہ کے معمولات اور اس کی تعمیری تفصیلات بھی اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں۔کتاب کا دوسرا حصہ افتخار احمد عدنؔی کا تحریر کردہ ہے۔جس میں ذہین شاہ تاجیؒ اور ان کے خلیفہ بابا انور شاہ ذہینی تاجیؒ کے حالاتِ زندگی کو مختصر بیان کیا گیا ہے۔

'تاج الاولیا'' کا اسلوب عام فہم مگر ادبی نوعیت کا ہے۔نثر میں روانی ہے۔چند ایک مواقع پر اشعار کا استعمال بھی کیا گیا ہے جو اردو اور فارسی میں ہیں۔اگر فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی دے دیا جاتا تو اردو قاری اشعار سے زیادہ محظوظ ہو سکتے تھے۔تحقیقی انداز کی جھلک بھی کچھ مقامات پر موجود ہے۔خاص کر سنِ پیدائش اور سلسلۂ نسب کے بارے میں۔بابا تاج الدینؒ کے ارشادات کو من وعن نقل کیا گیا ہے۔جس میں ایک بے تکلفی اور مشفقانہ لہجہ نظر آتا ہے۔ہندی الفاظ کا استعمال بھی دکھائی دیتا ہے۔جو ہندی لفظ اردو میں رائج نہیں ہیں،ان کے اردو ترجمے دیے گئے ہیں۔اقتباس دیکھیے:

''واکی شریف کے جنگل میں نصف شب کے بعد دریا کے کنارے حضور [بابا تاج الدینؒ] رونق افروز تھے۔چودھویں کا چاند اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ ندی کے پانی میں جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔شجر،حجر،لباسِ نور میں ملبوس تھے۔فضا خاموش تھی۔حضور نے ماہ نیم ماہ کی طرف دیکھا اور یہ شعر پڑھا۔

ایک اشارے میں کیا چاند کا دل دو ٹکڑے
عاشق اس آن کو برچھی کی انی کہتے ہیں

اور انگشتِ شہادت سے چاند کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے''اس آن کو برچھی کی انی کہتے ہیں۔'' زوردار لہجے میں فرمایا۔

چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے اور چند لمحوں میں ایک ہو گئے

بگوشِ معنی زحق شنیدم منم محمد منم محمد
جمالِ خود را خود آفریدم منم محمد منم محمد
محمد میں فنا جب ہو گئے باقی محمد ہیں''
جہاں میں جس جگہ دیکھو گے تم ساقی محمد ہیں [۱۵]

حاشیے میں مذکورہ واقعے کے راوی عبدالغنی فلائنگ آفیسر کا کراچی کا پتا بھی دیا ہے۔جن کے والد نے یہ واقعہ دیکھا تھا۔

'تاج الاولیا'' کی اشاعت ادارہ تعلیم وثقافت اسلامی، کراچی کے تحت ہوئی ۔دیگر اشاعتی تفصیلات درج نہیں ہیں۔البتہ ڈاکٹر محمد محمود احمد کا مقدمہ جنوری ۱۹۵۹ء میں تحریر کیا گیا ہے۔[۱۶] جس سے پتا چلتا ہے کہ اس کا اوّل ایڈیشن ۱۹۵۹ء یا ۱۹۶۰ء میں شائع کیا گیا ہوگا۔

''مختصر تذکرہ شاہ ولی محمدؒ'' میں میر پور خاص میں خانقاہِ چشتیہ کے بانی اور سلسلۂ چشتیہ کو فروغ دینے والے حکیم سید اکرام حسین شاہ سیکریؒ کا تحریر کردہ ہے۔مصنف نے مختصراً شاہ ولی محمدؒ کے حالاتِ زندگی کو قلم بند کیا ہے۔اِس تذکرے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شاہ ولی محمدؒ کا شجرۂ نسب مکمل دیا گیا ہے۔صرف شجرے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ کچھ بنیادی معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔لکھا ہے کہ حضرت امام علی رضاؓ سے لے کر حضرت مخدوم سید ابوالخیرؒ تک آٹھ بزرگ مدینہ منورہ ہی میں رہے۔۱۷ ان کے بعد والے بزرگان کی معلومات سنین کے ساتھ دی گئی ہیں۔ یہ معلومات مختصر ہیں۔بعد ازاں صاحبِ تذکرہ شاہ ولی محمدؒ کی پیدائش، بچپن، تعلیم، اساتذہ کا تذکرہ اختصار سے کیا گیا ہے۔انؒ کی تصانیف میں سے ایک کا تذکرہ کیا ہے جو عربی اور فارسی کے قواعدِ صرف ونحو پر مشتمل ہے۔

شاہ اکرام حسین سیکریؒ نے شاہ ولی محمدؒ کے حالاتِ زندگی رقم کرنے کے لیے ابتدائی اور اوّلین مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔مؤلف لکھتے ہیں کہ ''درگاہ شریف کے قدیم کاغذات سے ظاہر ہے، ۴، ذی الحج ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء یوم پنج شنبہ [جمعرات] کو سیکر میں طبیبِ سرکاری کے عہدے پر مامور ہوئے۔''[۱۸]

''مختصر تذکرہ شاہ ولی محمدؒ'' کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ جہاں صاحبِ تذکرہ شاہ ولی محمدؒ کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں اُس دور کی سیاسی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔گویا اُن کی حیات کو تاریخ سے جوڑنے کی سعی کی گئی ہے۔اس تذکرے سے پتا چلتا ہے کہ ۱۲۳۳ھ میں اجمیر کو انگریزوں نے فتح کر لیا تھا۔[۱۹] ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ آپؒ کے اخلاق سے متاثر ہو کر ایجنٹ گورنر جنرل (AGG) نے ان سے بیعت کی تھی۔[۲۰] مگر یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ اے۔جی۔جی نے اسلام قبول کیا تھا یا نہیں؟ بیعت کرنے کی اہمیت اپنی جگہ مگر اسلام لانے یا نہ لانے کا ذکر بھی ضروری تھا۔زیرِ بحث تذکرے میں شاہ ولی محمدؒ کی بیعت، رشد وہدایت اور تبلیغی خدمات کا بیان بھی ہے۔کتاب کا ایک حصّہ اُن پر لکھی گئیں منظوم مناقب پر مشتمل ہے جو سید اکرام حسین چشتیؒ نے مختلف شعرا سے لکھوائیں ہیں۔

سوانحی کتب اور تذکرے کا مقصد سالکین کے لیے بالخصوص اور عوام الناس کے لیے بالعموم مثالی حالاتِ زندگی پیش کر کے، اُن میں اچھائیوں کی ترغیب اور برائیوں سے روکنا مقصود ہوتا ہے تاکہ نیک لوگوں کا معاشرے میں پلڑا بھاری رہے اور زندگی پُرسکون، آسان اور سہل ہو جائے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم یاب ہوتی جا رہی ہے۔زندگی کے اس معاشرتی پہلو کا تذکرہ وفا راشدی نے یوں کیا ہے۔

''سائنس کے اس ترقی یافتہ میں جب کہ انسان، انسانیت کو ترستا ہے۔خلوص، محبت اور رواداری کا فقدان

ہے ع

صدق و اخلاص و صفا باقی نہ ماند

کی وجہ یہ ہے کہ ہم مذہب و روحانیت سے بہت دور جا چکے ہیں۔ ہم ایسی گُھٹی گُھٹی فضا اور گھناؤنے ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ جہاں بقول حضرت جگر مرادآبادی مرحوم

جہل خرد نے دن یہ دکھائے

گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ان حالات کے پیش نظر ماحول اور معاشرے کی اصلاح و تطہیر کی خاطر ایسے لٹریچر کی اشد ضرورت ہے جو اللہ اور رسولؐ کی تعلیمات، اسلاف کے کارناموں اور اسلام کی عظمتوں کا حامل ہو۔''[۲۱]

سوانحی ادب کے بارے میں وفا راشدی کی یہ رائے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ'' سوانح و تذکرے قوم کے اخلاق و کردار سنوارنے اور روحانی تربیت میں مدد دیتے ہیں اور آنے والی نسلیں ان سے روشنی کا کام لیتی ہیں۔'' [۲۲] کتاب کی تالیف کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ شاہ ولی محمدؒ کے وصال کو سو سال ہونے والے تھے۔[۲۳]

''مختصر تذکرہ شاہ ولی محمدؒ'' کا اندازِ بیان سادگی لیے ہوئے ہے۔ ہر قاری اس کتاب سے استفادہ کر سکتا ہے۔ ادبی رنگ کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ بہت سی معلومات کو سنین کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک مختصر معلوماتی تذکرہ ہے۔ جس میں کرامات کا ذکر نہیں ہے۔ ایک واقعہ مذکور ہے، جس سے بھی ممدوح کی ماورائی صفت کا گمان نہیں ہوتا۔ کتاب کا اسلوب ملاحظہ کیجیے:

''خلافت و اجازت کے بعد ہی آپؒ کی ذاتِ اقدس سے ہدایت و عرفاں کا چشمۂ فیض جاری ہونے لگا۔ تعجّب کی بات یہ ہے کہ اکثر بزرگان مشائخ کو درجہ ریاضاتِ شاقہ اور عرصۂ طویل کے بعد نصیب ہُوا کرتا ہے۔ کو وہ بہت جلد حاصل ہو گیا اور آپ ؒ کے مریدین و معتقدین بہت جلد کمالات کو پہنچنے لگے، اِس سے حضرت مسکین شاہ صاحبؒ کے روحانی تصرّف اور آپ کی استعداد اور فطری قابلیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔''[۲۴]

''مختصر تذکرہ شاہ ولی محمدؒ''، ۳۰، دسمبر کو مکمل ہُوئی اور اس کی پہلی اشاعت ۱۹۶۳ء اور دوسری ۲۰۰۰ء میں ہوئی۔ اس تذکرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا فارسی ترجمہ ڈاکٹر خضر نوشاہی اور سندھی ترجمہ محمد موسیٰ بھٹو نے کیا۔ یہ دونوں طبع ہو چکے ہیں۔ شاہ اکرام حسین کی تمام کتب جناب تاج محمد چشتی ایم۔اے نے عاریتاً فراہم کی۔ موجودہ صورت میں خانقاہ کی لائبریری مقفّل ہے۔ جس میں شاہ اکرام حسین سیکریؒ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب موجود ہیں۔ اس لیے ان کتب

کے حصول میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

شاہ اکرام حسین سیکریؒ کی ایک اور کتاب 'تذکرہ امام حسین علیہ السلام'' کی اشاعت کا محرک اس کی ماہِ محرم میں اشاعت اور پیش لفظ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ محرم الحرام جو حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا مہینا ہے، اس موقع کی مناسبت سے مصنف نے ہر سال ایک کتاب اہلِ بیت کے بارے شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اِس تذکرے کی اشاعت سے قبل بھی اسی مہینے میں حضرت امام حسینؓ کی شخصیت پر ایک مختصر رسالہ شائع اور مفت تقسیم کیا گیا تھا۔ اسی سلسلے کو مستقل جاری کرنے کی نیّت کے لیے ایک تنظیم ''ادارہ بُستانِ رسول'' کی داغ بیل ڈالی گئی۔ جس کے مہتمم سید ساجد علی حسنی تھے۔ کتاب کا آغاز'' بنام جہاں دار و جان آفریں'' کے عنوان سے کیا ہے۔ جس میں حمدیہ اور نعتیہ نثر اور اہلِ بیت کی توصیف بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد کتاب کا باقاعدہ آغاز علامہ اقبال کے اس شعر سے کیا گیا ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

آغاز میں ایک سوال اُٹھایا گیا کہ جب حضور ﷺ کو شہادت کا ذوق وشوق تھا تو آپؐ کو یہ مرتبہ کیوں حاصل نہیں ہُوا؟ اس ذوق وشوق کے بارے میں ایک حدیث بھی بیان کی گئی ہے۔ اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ اگر آپؐ شہید ہوجاتے تو مسلمان منتشر ہوجاتے، جیسا کہ جنگِ احد میں آپؐ کی شہادت کی افواہ سُن کر مسلمانوں کی حالت ہوئی تھی۔ بعد ازاں شہادت کی دو قسمیں سرّی اور جہری کی تعریف بیان کی گئی ہیں۔ جن میں سے اول الذّکر حضرت امام حسنؓ اور ثانی الذکر حضرت امام حسینؓ کو حاصل ہوئیں، کیوں کہ شہادتِ جہری میں شہادت کی تشہیر ہوتی ہے اور ہر خاص و عام کو اس سے آگہی ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے قدرت نے جو التزامات کیے، انھیں سید اکرام حسین چشتیؒ نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس میں اندازِ بیان اور اسلوب کی روانی بھی موجود ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔ شہادت جہری کا تذکرہ فرمانے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

''اس شہادت کا دارومدار تشہیر و اعلان پہ ہے، اسی وجہ سے اولاً اس شہادت کی خبر وحی میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی زبانی معلوم ہوئی اور دیگر فرشتوں نے بھی آن حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی اور آن حضرت ﷺ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی قبلِ وقوع واقعہ، اِس شہادت کی خبریں بڑی شد و مد سے دیں، یہاں تک کہ کوئی دقیقہ اس کے اشتہار اور شہرت کا باقی نہ چھوڑا۔ آثارِ شہادت ارضی و سماوی اس کے اظہارِ عام کے لیے واقع ہوئے۔ مثلاً خاک مبدّل ہوگی اور پتھروں سے خون جاری ہوا، یہاں تک کہ بیت المقدّس کا کوئی پتھر ایسا نہ تھا، جس کے نیچے تازہ خون بہتا ہوا نہ پایا گیا ہو۔ آسمان سے خون کا برسنا غیب سے رونے کی آوازیں آتی تھیں اور جنّات نوحہ کرتے تھے۔ شہیدوں کی لاشوں کی حفاظت صحرائی درندوں اور

سہائم نے کی، اس سے چاروں طرف اور بھی شہرت ہوگئی۔ قاتلوں کی ناک میں سانپ گُھسے اور حضرت امام عالی مقام کی شہادت کے بعد ہی سے قاتلان امام انواع واقسام کی عقوبتوں میں گرفتار ہوگئے اور اس واقعہ کے بعد دس پانچ سال بھی زندہ نہ رہے۔ اونٹوں کا گوشت کڑوا ہوگیا اور عرب کے دستور کے موافق جب عورتیں زعفران اپنے من سے مَلتی تھیں تو وہ سیاہ ہوجاتا تھا، روزِ روشن اندھیری رات میں تبدیل ہوگیا تھا۔ ان تمام واقعات کے وقوع پذیر ہونے کا مطلب یہ تھا کہ تمام حاضر وغائب اس واقعہ ہوش ربا سے مطلع اور آگاہ ہوجائیں اور تا قیامت یہ غم دنیا میں یادگار رہے۔''[۲۵]

پورے تذکرے میں عقیدت ومحبت کا یہی رجحان نمایاں ہے۔ سوانح میں عظمتِ امام حسینؑ کے مختلف پہلوؤں کا تذکرۂ احادیث کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ جن کتب سے استفادہ کیا گیا ہے، ان کے نام دیے گئے ہیں۔ مگر معلومات کے تفصیلی حوالے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یعنی تحقیقی انداز بہت ہی کم ہے۔ اس عنوان کے اختتام پر معین الدین چشتیؒ کی دو فارسی رباعیات بلا ترجمہ دی گئی ہیں۔ راقم کا خیال ہے کہ اردو قارئین کے لیے تحریر کردہ کتب میں دیگر زبانوں کے اشعار یا نثری جملوں کا اردو ترجمہ دینا چاہیے۔

شہادتِ سرّی اور جہری کے بعد شاہ اکرام چشتیؒ نے حضرت امام حسینؓ کے حالاتِ زندگی کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ کی پیدائش نسب، بچپن اور تربیت کو بیان کیا ہے۔ بچپن کے اُن واقعات کو پیش کیا ہے، جن سے آپؓ کی عظمت اور آپ ﷺ کی ان ؓ سے محبت کا پتا چلتا ہے۔ اس مختصر سوانح میں بیش تر وہ واقعات پیش کیے ہیں، جن میں امام حسینؓ کی عظمت کا تذکرہ آپؐ نے مختلف واقعات اور موقع پر کیا ہے۔ ایسی احادیث کو بھی بیان کیا گیا ہے، جن سے حضور ﷺ کی امام حسینؓ سے غیر معمولی محبّت کا پتا چلتا ہے۔ پھر چاروں خلفاے راشدینؓ کے عہد میں انؓ کی اہمیت کا تذکرہ ہے۔ جیسا کہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں امام حسینؓ کو دیکھ کر آپ ﷺ کی یاد تازہ کرلیا کرتے تھے۔ جب کہ حضرت عمر فاروقؓ کو اپنے فرزند سے بھی زیادہ محبت اور ترجیح دیا کرتے تھے اور اس کا برملا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ اِس حوالے سے دو تین واقعات بھی پیش کیے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کا جب بلوائیوں نے محاصرہ کیا تو حضرت علیؓ کے کہنے پر امام حسنؓ اور امام حسینؓ نے حضرت عثمانؓ کی حفاظت کی ذمّے داری نبھائی۔ حضرت علیؓ کے عہد میں جنگِ جمل کے بعد حضرت عائشہؓ کو مدینے منوّرہ لے جانے کے لیے امام حسینؓ کے ساتھ روانہ کیا۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امام حسینؓ نے امام حسنؓ کی معاونت فرمائی۔ ایک موقع پر کچھ افراد نے امام حسینؓ سے بیعت کرنے کی خواہش کا اظہار فرمایا تو انھوںؓ نے ان کو منع فرمادیا۔

کچھ واقعات اس طرح کے بھی درج کیے ہیں، جن سے امام حسینؓ کی سیرت کے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس تذکرہ کو معلوماتی بنانے کے ساتھ اصلاحی پہلو اجاگر کرنے کے لیے اُن کے کچھ ملفوظات بھی پیش کیے ہیں۔ جن کے

اسلوب میں اختصار پایا جاتا ہے۔امام حسینؓ کی شہادت کے واقعہ کو انتہائی مختصر بیان کیا ہے۔مؤلف کی خواہش تھی کہ آئندہ سال واقعہ کربلا پر روشنی ڈالی جائے گی۔شاید یہ خواہش بر نہیں آئی۔ ہندوستان کے دو ایسے محیر العقل واقعات بھی پیش کیے ہیں۔جن سے امام حسینؓ کی روحانی مرتبہ کا بھی پتا چلتا ہے۔ پہلا واقعہ تقسیم ہند سے قبل سیکر میں مؤلف کے ساتھ پیش آیا۔ جب کہ دوسرے کا تعلق ہندوستان کے مقام جاورہ سے ہے۔آخری الذّکر کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔کتاب کے آخری جزو میں مؤلف اور دیگر شعرا کا حضرت امام حسینؓ کو منظوم خراجِ تحسین ہے۔اِن شعرا میں سید ضامن علی حسنی نارلوی ،مؤلف کا سلام اور مولانا شاہ نیاز احمد بریلویؒ،علامہ اقبالؒ،سید حشمت حسین حشمت،مرزا غالب اور خادم اجمیری کا کلام شامل ہے۔

کتاب کا اسلوب رواں اور پُر تاثیر ہے،الفاظ عام فہم ہیں۔ ہندی رنگ کی جھلک بھی کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔جملے اختصار لیے ہوئے ہیں۔واقعاتی اندازِ بیان دل چسپی کا حامل ہے۔اسلوب کی مثال دیکھیے۔

> ''حضرت نے محی الدّین احمد سے کہا، ہوشیار رہنا۔خیال ہوتا ہے کہ آج شاید پھر زیارت ہو، چناں چہ اسی شب نو بجے ٹیکری پر سے غُل ہُوا کہ زیارت ہوئی اور ٹیکری شریف پر اس وقت کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ یہ غل سُن کر حضرت ڈیرے سے باہر آئے اور مع ہمراہیان خود ایک مقام پر دست بستہ مؤدب کھڑے ہو گئے۔دیکھا کچھ سوار مسلح اور مکمل اسی میدان ریت پر،ان کے ساتھ روشنیاں ہیں،مثل مشعل کے،ظاہر میں کوئی مشعل نہیں تھی۔ان حضرات کے لباس اور جسم سے یہ روشنی پیدا ہو رہی تھی۔''[۲۶]

''تذکرۂ امام حسین علیہ السلام''، کو ادارہ بُستانِ رسول حیدرآباد نے مارچ ۱۹۷۰ء/محرم الحرام ۱۳۹۰ھ میں شائع کیا۔

''میرے مرشد حضرت عارفی''مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کی تصنیف ہے،جیسا کے نام ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تصنیف مصنف نے اپنے مرشد کے لیے تحریر کی ہے۔اِسے ایک مکمل اور جامع سوانح نہیں کہا جا سکتا ،کیوں کہ اس میں ممدوح حضرت عارفیؒ کی زندگی کے بارے میں ابتدائی معلومات نہیں دی گئی ہیں۔ بلکہ اس میں اُنؒ کے اُس وقت سے حالات بیان کرنا شروع کیے ہیں،جب سے مصنف نے ہوش مندی کی زندگی شروع کی۔اس کتاب کے مطالعے سے صاحبِ سوانح کے معمولات اور کردار پر واضح روشنی پڑتی ہے۔جس انداز سے یہ کتاب تحریر کی گئی ہے،اُس سے سوانح نگار کے بارے میں بھی خاصی معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔زیرِ بحث کتاب کا اندازِ تحریر خودنوشتانہ ہے۔جس میں مصنف پوری کتاب میں اپنے ممدوح کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔اِس اندازِ تحریر کی وجہ سے کتاب میں دل چسپی کا عنصر آخر تک قائم رہتا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے یہ بات بہت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر محمد عارفیؒ نہ صرف شاعری کا ایک اعلا ذوق

رکھتے تھے بلکہ زبان و بیاں پر قدرت رکھنے والے شاعر بھی تھے۔جن کے اشعار میں صوفیانہ مضامین غزلیہ انداز میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ نیز اُن کے معمولات بالخصوص ہومیوکلینک اور مجالس کا تذکرہ بار بار آیا ہے۔ڈاکٹر محمد عارفی کی سیرت کے جن پہلوؤں پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے،اُن میں سے ایک اہم پہلو وقت کی قدر ہے۔انھوں نے زندگی گزارنے کا ایک نظام الاوقات طے کر رکھا تھا۔جس پر وہ ساری زندگی ثابت قدم رہے۔اس وقت کی پابندی کے بارے میں مصنف تحریر فرماتے ہیں:

''زندگی کے تمام کاموں کے لیے صبح سے رات تک کا ایک نظام الاوقات مقرر تھا،جس کی پابندی صحت و بیماری میں اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ ان کو دیکھ کر گھڑی ملائی جاسکتی تھی،جب تک بیماری کی شدت سے بالکل بے بسی نہ ہوجائے معمولات میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔''[۲۷]

یہ مختصر سوانح ایک سو گیارہ (۱۱۱) صفحات جو عام کتابی سائز سے بھی کچھ چھوٹے سائز میں ہے۔جس میں انؒ کی خانقاہی خدمات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے،جس سے پتا چلتا ہے کہ کلینک کے ساتھ وہ ہفتے میں دو مجالس کیا کرتے تھے۔ایک خصوصی اور ایک عمومی۔عمومی نشست تو جمعہ کو منعقد ہوا کرتی تھی۔جس میں مرد و خواتین کی بڑی تعداد شریک ہُوا کرتی تھی۔اس وجہ سے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ناگزیر ہوجاتا تھا۔جب کہ خصوصی نشست میں مخصوص افراد آیا کرتے تھے۔مگر کسی کے آنے پر پابندی نہیں تھی۔اسی لیے بہت جلد اس محفل میں بھی تعداد اس قدر ہوگئی کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال کیا جانے لگا۔اس مخصوص نشست کی روحانیت اور پُر کیف ماحول کا اندازہ مصنف کے اس بیان سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔''پیر کی اس پُر کیف مجلس کا کچھ حال ذکر کرنا چاہتا ہوں۔۔۔لیکن سمجھ میں نہیں آرہا،کیا کہوں؟ کس طرح کہوں؟ قوتِ بیان کہاں سے لاؤں؟ کہہ بھی سکوں گا یا نہیں؟''[۲۸]

اگرچہ ''میرے مرشد حضرت عارفی'' ایک مختصر سوانح ہے مگر اس میں خانقاہی اور صوفیانہ نکات اس انداز سے پیش کیے گئے ہیں کہ یہ ایک کتاب کسی بھی خانقاہی ادب کی سوانح سے کم معلوم نہیں ہوتی۔صرف چند باتیں پیش کرتا ہوں،ایک موقع پر مصنف کسی دعوت میں شریک تھے جس میں ایک گھنٹے تاخیر تھی۔اس وقت کو غنیمت جان کر وہ اپنے مرشد ڈاکٹر محمد عارفیؒ کے ہاں تشریف لے گئے۔جب محمد رفیع عثمانی سے پوچھا گیا،کیسے آنا ہُوا تو حقیقت بیان کردی،اس کے جواب میں بے ساختہ فرمایا ''بھئی آپ نے ہمیں یہ کیوں بتایا؟ ہم یہ سمجھ کر خوش ہو رہے تھے کہ ہمارے ہی پاس آئے ہیں،آپ نے یہ بتا کر ہماری خوشی آدھی کردی۔''[۲۹] یہ ہے وہ نکتہ جسے شیخ سعدیؒ نے فرمایا تھا کی ''دل بدست آرد کہ حج اکبر است'' کسی کا دل خوش کرنا،حج اکبر ہے۔اسی طرح انھوں نے سالکین اور عوام و خواص کی تربیت کا جو انداز اختیار کیا تھا۔وہ بھی اپنی مثال آپ تھا،یہ طریقۂ تربیت موجودہ دور کے مشائخ کے لیے مشعلِ راہ ہے۔یہ اندازِ تربیت غیر محسوسانہ ہوتا تھا۔حدیث کے مطابق آسانی پیدا کرنے کے قائل تھے۔اس طرح سے ذکر و فکر کی ترغیب دیا کرتے تھے کہ طالب کو کسی مشکل کا احساس

نہ ہوتا تھا۔اس تربیتی پہلو کا مطالعہؒ کے رسالے ''معمولات یومیہ ومختصر نصاب اصلاح نفس'' میں کیا جاسکتا ہے۔[۳۰]

کتاب کا بنیادی محرک تو مرشد کی محبت اور عقیدت ہی ہے۔اس کا ایک اور سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب دارلعلوم کے ماہ نامہ رسالے ''البلاغ'' کا خصوصی شمارہ ''عارفی نمبر'' شائع کیا جارہا تھا تو مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے بھی اپنے خیالات کا تحریری اظہار کیا جو اُس شمارے میں شائع ہوئے۔بعدازاں ''ادارۃ المعارف'' کراچی نے افادہ عام کے پیشِ نظر اسے کتابی صورت دے دی۔[۳۱]

اس کتاب کی اہم خصوصیت اس کا اندازِ تحریر ہی ہے، جو عموماً سوانح میں نہیں ہوتا۔خودنوشتی اندازِ بیان نے اس میں وہ روانی اور دل کشی پیدا کردی ہے کہ قاری کا دل بے اختیار کتاب کو پڑھتے رہنے پر مجبور کردیتا ہے۔کتاب کے اختتام تک یہی صورت رہتی ہے۔دل چاہتا ہے کہ کتاب جاری رہے۔زیرِ بحث کتاب کے اسلوب کی خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں ڈاکٹر محمد عارفیؒ کے موتی جیسے اشعار موضوع کی مناسبت سے ایسے پرو دیے ہیں کہ جیسے یہ اشعار ان ہی مواقع کے لیے تخلیق کیے گئے ہوں۔اس انداز سے مفتی محمد رفیع عثمانی کے شعری ذوق کے ساتھ اپنے مرشد اور ان کی شاعری سے خاص محبّت کا پتا چلتا ہے۔مصنف کی تحریر کا نمونہ دیکھیے:

> ''جس سے بھی ملتے، اُسے دعاؤں سے نہال فرمادیتے تھے، آپ سے، جس کا بھی تعلق تھا، وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ حضرت کو مجھ سے خصوصی محبت ہے، حیرت ہوتی تھی کہ اتنی مصروفیت میں ہزاروں اہلِ محبت کا حق الگ الگ کیسے ادا کرتے ہیں؟ اور جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت سمائی ہوئی ہو، وہ اتنی محبتوں کو اپنے دل میں کیسے جمع کرتا ہے؟ لیکن دیکھا جائے تو درحقیقت یہ ایک ہی محبت کے لیے بے شمار مظاہر تھے۔محبوب کی ہر چیز محبوب ہوتی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ جو محبوبِ حقیقی ہیں، ان کی ہر مخلوق سے آپ کو محبت تھی، ایک مرتبہ فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ کی محبت کا مصرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور مخلوق خدا سے محبت کرو۔''[۳۲]

اس کتاب کی جدید اشاعت شوال ۱۴۲۲ھ/جنوری ۲۰۰۲ کو ادارۃ المعارف کراچی سے ہوئی۔''عرضِ ناشر'' جمادی الثانی ۱۴۱۵ھ کا تحریر کردہ ہے۔اس کے مطابق پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہوگا۔

پروفیسر فیاض کاوشؔ وارثیؒ کو سوانح نگاری میں ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔وہ کتاب مختصر تحریر کریں یا مفصّل ہر دو میں کمال کا درجہ رکھتے ہیں۔اُن کی تحریر کو اسلوب کے سبب علمی وادبی حلقوں میں پسند کیا جاتا ہے۔بزرگان دین اور اولیائے کرام سے خاص محبّت رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زندگی کی آخری کتاب بھی برصغیر کی مشہور ہستی ''خواجہ غریب نوازؒ'' کی سیرت پر تحریر فرمائی۔یہ وہ ہستی ہے، جنھوں نے برصغیر میں چشتیہ سلسلے کو عام کیا اور دوسرے ممالک تک بھی پہنچایا۔ان میں افغانستان، ملایا، انڈونیشیا اور جنوبی افریقہ اہم ہیں۔

''خواجہ غریب نوازؒ'' ایک انتہائی مختصر کتاب ہے۔اس میں مصنف نے خواجہ غریب نوازؒ کی حیاتِ مبارکہ کی بنیادی اوراہم معلومات مثلاً سنِ ولادت، جائے ولادت ،اجداد، تعلیم وتربیت،مرشد کی محبت،اُن کے حرمین شریفین سے ہندوستان کے سفر، اجمیر میں کس طورانھوں نے سلسلۂ تبلیغ شروع کیا، اُس کے کیا اثرات مرتب ہوئے ،ان سب کومختصراً بیان کردیا۔ملاحظہ کیجیے:

''برِّصغیر پاک وہند میں تبلیغِ اسلام کی بنیادوں کوآپ نے اپنی خداداد روحانیت کے زور سے جواستحکام بخشا ،تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی! کی مقناطیسی شخصیت کے اثر سے لوگ فوج درفوج دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔

کلمہ پڑھتے ہیں دیکھ کرتم کو بُت بنائے ہیں خدا نے کیسے'' [۳۳]

حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی زندگی کے ساتھ، اُن کے ۲۰ کے قریب ملفوظات اورمحفلِ سماع کے آداب بھی بیان کیے ہیں۔ابتدائیے میں قدرت اللہ بیگ نے فیاض کاوشؔ وارثی کے حالات،علمی خدمات اور کردار کے بارے میں تحریر کیا ہے۔فیاض کاوش وارثیؒ کی اولیائے کرام سے محبت اورعقیدت، کتاب کا بنیادی محرک بنی۔جس کا اظہار قدرت اللہ بیگ نے ابتدائیے میں کیا ہے۔انھوں نے وصیت کی تھی کہ انھیں میر پورخاص کے چشتی بزرگ خواجہ عبدالمجید چشتی سلیمانیؒ کے سائے میں دفن کیا جائے۔اس وصیت پرعمل بھی ہُوا۔[۳۴] راقم بھی اس تدفین میں شریک تھا۔وہ تحریر کے ذریعے تبلیغ کے خواہش مند تھے۔جس کے لیے وہ بھرپور سعی کرتے رہے۔اب اُن کے شاگرد یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ادارہ ''شرکتِ اسلامیہ'' میر پورخاص اسی مقصد کے تحت بنایا گیا تھا۔فیّاض کاوش اس کے روح ورواں تھے۔[۳۵] اولیائے کرام سے محبت اورتحریر کے ذریعے تبلیغ کی خواہش کا ثبوت، اُن کی تحریرکردہ کتب ہیں۔کتاب ''خواجہ غریب نوازؒ'' کے اسلوب کی مثال ملاحظہ کیجیے:

''اجمیر میں وارد ہوکرآپ نے ایک کھلے میدان میں ڈیرہ جمایا، وہاں کے راجا کے خدام نے آکر کہا کہ یہاں تو راجا کہ اونٹ بیٹھتے ہیں، وہاں سے یہ کہہ کراٹھ کھڑے ہوئے کہ: اچھا اب اونٹ ہی بیٹھتے رہیں! چناں چہ جب راجا کے اونٹ یہاں آکر بیٹھے تو بیٹھے کے بیٹھے ہی رہ گئے۔!!! شتربانوں نے اٹھانے کی لاکھ کوشش کی مگر وہ اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے، آخرعاجز آکر شتر بانوں نے حضرت خواجہ کے حضور معافی طلب کی۔آپؒ نے معاف فرمادیا تو اونٹ فوراً کھڑے ہوئے، یہ دیکھ کرسب حیران رہ گئے۔''[۳۶]

یہ کتاب غالباً ۱۹۹۹ء میں لکھی گئی اور اس کی اشاعت اکتوبر ۱۹۹۹ء میں، کے وصال کے بعد شرکتِ اسلامیہ میر پورخاص کے زیرِاہتمام ہوئی۔

مولانا محمد سہیل جن کی تصنیف ''مردِ باصفا'' زیرِ بحث ہے۔سوانح نگار کا تعلق کراچی سے ہے مگر اب مدینہ منورہ ہجرت کر گئے ہیں۔شاید اسی سبب نام کے ساتھ مہاجر مدنی کا لاحقہ استعمال کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اِن کے مرشد صوفی محمد اقبالؒ بھی نام کے ساتھ ''مہاجر مدنی'' استعمال فرمایا کرتے تھے۔مرشد کی تقلید بھی اس کا ایک سبب ہوسکتا ہے، پھر اِن دونوں الفاظ کا تعلق آپ ﷺ سے بھی ہے اور آپؐ کی محبت خانقاہی نظام کا اہم ترین جزو ہے۔مولانا محمد سہیل کا تعلق کراچی اور سندھ سے آج بھی قائم ہے۔ ہر رمضان المبارک میں کراچی آکر خانقاہ میں مہینے بھر کے اعتکاف کا اہتمام کرتے ہیں اور پورے پاکستان سے لوگ مختلف ایّام کے لیے اعتکاف میں شریک ہوکر فیوض و برکات حاصل کرتے ہیں۔ راقم کو بھی یہ شرف حاصل رہا ہے کہ تین دن رمضان المبارک میں کورنگی کی خانقاہ میں اُن کی صحبت سے مستفیض ہوا۔

مولانا محمد سہیل کی تصنیف ''مردِ باصفا'' صوفی محمد اقبال مہاجر مدنیؒ کی سوانح حیات ہے۔اِسے مصنف نے پندرہ ابواب میں پیش کیا ہے، اِن ابواب کو کوئی عنوان نہیں دیا گیا ہے مگر ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر باب میں حالاتِ زندگی کے کسی ایک خاص پہلو کو پیش کیا گیا ہے۔جس سے صوفی محمد اقبالؒ کے زندگی کے اُس گوشے سے خاصی شناسائی ہوجاتی ہے۔مثلاً پہلے باب میں صاحبِ سوانح کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جس میں ؒ کی ولادت، بچپن، تعلیم، خاندان، والدین اور حصولِ علم کے لیے اسفار وغیرہ کی تفصیل دی گئی ہے۔بہن بھائیوں کے نام تحریر کیے ہیں مگر دیگر معلومات بہت ہی کم دی ہیں۔نیز والد کے وصال اور والدہ کے تقوے کا ذکر ہے مگر وصال یا حیات کی مزید کچھ تحریر نہیں کیا ہے۔اِس باب کے مطالعے سے ممدوح کی شخصیت کا ایک خاص تأثّر ذہن پر مرتسم ہوجاتا ہے۔انھیں صرف حصولِ علم کا ذوق وشوق ہی نہیں تھا بلکہ عشق کی وہ چنگاری ان کے دل میں پیدا ہوگئی تھی، جس کی خواہش اہل اللہ کیا کرتے ہیں۔ اسی لیے اساتذہ بھی اُن کی قدر کیا کرتے تھے۔اس کا اندازہ اُس گفتگو سے لگایا جاسکتا تھا جو انھوں نے اپنے بڑے بھائی سے بیماری کی حالت میں فرمائی تھی۔صوفی محمد اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ اللہ کا ہم پر بڑا احسان ہے کہ ہمیں اس نے مسلمان گھرانے میں پیدا فرمایا۔اگر ہماری عمر کروڑ سال ہو اور ساری زندگی عبادت میں گزار دیں پھر مر جائیں، اس طرح کی زندگی کئی بار ملے اور عبادت میں گزرے، پھر بھی اللہ کا شکر ادا نہیں ہوسکتا۔مؤلّفِ کتاب سہیل احمد نے ان کے مزاج کے بارے میں فارسی کا یہ شعر ترجمے کے ساتھ درج کیا ہے۔

نخواہم جُز تو یک ساعت تفکر در دگر کردن

کہ در ہر دو جہاں جاناں ندارم جُز تو دلدارے

میں نہیں چاہتا کہ تیرے علاوہ ایک لمحہ بھی کسی دوسرے کے بارے میں سوچوں، کیوں کہ دونوں جہانوں میں، اے محبوب! تیرے سوا میرا کوئی مقصود نہیں۔(۳۷) بقولِ غالب

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

۴۳۴صفحات پر مشتمل یہ سوانح صوفی محمد اقبال مہاجر مدنیؒ کے مفصل اور جامع حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔جس میں ان کے روحانی سفر، پاکستان سے مدینے کا سفرعلمی،تبلیغی اور خانقاہی نظام کی ترویج،عادات،اخلاق،صفات اور خوبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔جن سے اُن کی شخصیت اور کردار کی عظمت کے وہ پہلو سامنے آتے ہیں جو سالکین اور عوام النّاس کی زندگی کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔صاحبِ سوانح ؒ کے بارے میں مجازین کے مشاہدات،خیالات اور تاثرات کو بھی کتاب کی زینت بنایا گیا ہے۔صرف عقیدت مندوں کے خیالات ہی کتاب میں شامل نہیں کیے گئے ہیں بلکہ اُس دور کے اکابرین اور معاصرین کی نظر میں انؒ کا کیا مقام تھا،وہ بھی اس سوانح کا حصّہ ہے۔ان میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا ؒ،مولانا محمد یوسف دہلویؒ،مولانا ابوالحسن علی میاںؒ،مولانا منظور نعمانیؒ،مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ،مفتی محمد تقی عثمانی وغیرہ شامل ہیں۔

صوفی محمد اقبالؒ کے خطوط بھی اس سوانح کا جزو ہیں۔جن سے اُن کے نظریۂ تبلیغ،اندازِ تبلیغ اور زندگی کے اصلاحی پہلوؤں پر گہری نظر کا پتا چلتا ہے۔خطوط کے ساتھ ؒ کی چند تحریریں بھی اس کتاب کی وقعت میں اضافے کا سبب بنی ہیں۔اِن میں شریعت وطریقت کا تلازم،بہت شرم ناک وخطرناک عالم گیر زہریلے اثرات اوران سے بچاؤ،نسبتِ اویسی اور دیارِعرب میں چندروز شامل ہیں۔انؒ کی تصانیف وتالیفات کی تفصیل اور مختصر تعارف بھی دیا گیا ہے۔آخر میں انؒ کے مجازین کی چار اقسام بیان کرکے،ان کے پتے بھی اصلاحی پہلو سے درج کر دیے گئے ہیں۔پہلی قسم ان خلفا کی ہے جو صوفی محمد اقبالؒ سے بیعت ہوئے،استفادہ کیا اور پھر مُجاز بیعت ہوئے۔جس میں مؤلف مولانا سہیل احمد کا نام بھی قسمِ اوّل میں تیسوین (۳۰ویں) نمبر پر درج ہے۔دوسری قسم اُن حضرات کی ہے جو انؒ سے بیعت نہیں تھے مگر مجاز بیعت تھے۔تیسری قسم میں وہ شخصیات شامل ہیں جو پُرانے مشائخ سے مُجاز تھے۔مگر ان سے استفادہ کیا یا اجازت طلب کی۔ایسے افراد کو انھوںؒ نے تبرکًا بیعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔چوتھی قسم میں وہ حضرات شامل ہیں جنھیں اجازتِ مقیدہ عنایت کی گئی۔جب کہ تین افراد کو مجازِ صحبت بھی عطا کی۔کتاب کے آخر میں ان کی ۶۳ تصانیف وتالیفات درج کی گئی ہیں۔

''مردِ باصفا'' کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ صاحبِ سوانح صوفی محمد اقبالؒ نے جن اکابرین سے فیض حاصل کیا،ان کے بھی مختصر حالات حاشیے میں درج کر دیے ہیں۔جن سے نہ صرف اُن اکابرین کا تعارف ہوجاتا ہے بلکہ ایسا اندازِ تحریر اختیار کیا گیا ہے کہ حالاتِ زندگی کے مزید مطالعے کی ترغیب ملتی ہے۔ان میں پروفیسر الشاہ جلیل احمدؒ [۳۸] اور شاہ محمد زبیر کے حالات [۳۹] بھی شامل ہیں۔

کتاب کے محرکات کا تذکرہ مؤلف نے ابتدائیہ میں کیا ہے۔تحریر فرماتے ہیں کہ ''حضرت اولیأ اللہ کے نامِ مبارک

ہی سے دل میں ایک لذّت وحلاوت پیدا ہوتی ہے اور جیسا کہ ان حضرات کی زیارت سے، حسبِ حدیث پاک (اِذَا رُؤُا ذُکِرَ اللّٰہ) دل میں اللہ کی یاد نصیب ہوتی ہے۔ ایسے ہی ان کے حالات پڑھنے سننے سے دین کی عملی تصویر قلوب میں سماجاتی ہے اور ان کے واقعات، عبرت، نصیحت اور قلوب وروح کے لیے نشاط وانشراح کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں عقائد میں پختگی، ایمانی کیفیات میں زیادتی اور اعمال میں دل بستگی پیدا ہوتی ہے۔''[۴۰] گویا بزرگوں کے حالاتِ زندگی کے مطالعے سے افکار واعمال میں مُثبت تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں خانقاہی نظام میں جس طرح وراثتی گدی نشینی کا طریقہ رائج ہُوا ہے، اس طریقے میں ایسے وارث بھی گدّی نشین ہوجاتے ہیں ہیں، جن کی خانقاہی تربیت ہوئی ہوتی ہے نہ وہ صوفیانہ تعلیمات سے آشنا ہوتے ہیں۔ وہ گدّی نشین ہوکر جو گُل کھلاتے ہیں، انھیں دیکھ کر خانقاہی نظام پر انگلیاں اُٹھتی ہیں۔ ایسے دور میں صوفیائے کرام اور اولیائے کرام کے حالاتِ زندگی اللہ کی بڑی نعمت ہیں۔

''مردِ باصفا'' کا اندازِ بیان سادگی اور روانی لیے ہوئے ہے۔ کہیں کہیں تحقیقی انداز بھی نظر آتا ہے۔ بعض مقامات پر قرآن واحادیث کے حوالے نہیں دیے گئے ہیں۔ یقیناً یہ تحریر میں برمحل آئے ہیں۔ کتاب کے لوازمے کے بارے میں مصنف نے واضح انداز میں تحریر کردیا ہے کہ ''جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یا تو چشمِ دید حالات ہیں یا بعض باتیں حضرت اقدس کی زبان مبارک سے سُنی ہوئی ہیں یا بعض معتمد حضرات کی روایات ہیں۔ جن کے اسمائے گرامی بھی بین القوسین یا حاشیے میں ذکر کردیے گئے ہیں۔[۴۱] اسلوب میں فارسی اور اردو اشعار کا استعمال موقع کی مناسبت سے کیا گیا ہے۔ چند مقامات پر فارسی اشعار کے اردو معنی بھی درج کیے ہیں۔ عام فہم اسلوب کی وجہ سے عام اردو دان بھی اس سوانح سے استفادہ کرسکتا ہے۔ طرزِ تحریر میں رموز واوقاف کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ جس سے بیان میں کہیں ابہام باقی نہیں رہا۔ کتاب کی تصحیح خوانی میں مؤلف کے ساتھ پروفیسر محمد ظفر فاروقی اور پروفیسر محمد یعقوب خاور کی کاوشیں بھی شامل ہیں۔ طرزِ تحریر کا نمونہ ملاحظہ کیجیے، جس میں صوفی محمد اقبالؒ کے نکاحِ مسنونہ کا ذکر ہے۔

> ''کچھ کام کے سلسلے میں فیصل آباد تشریف رکھتے تھے، وہیں نکاح کا طے ہُوا۔ ؒ کے برادرِ مکرم ڈاکٹر محمد اسلم صاحب، لاہور میں تھے۔ آپؒ نے ان کو اطلاع دی، وہ جلدی جلدی تشریف لے آئے، انھوں نے کہا کہ ایک اور اچھی جگہ آپؒ کے نکاح کے لیے مَیں نے تجویز کی ہوئی تھی۔ آپؒ نے ان سے کہا کہ یہ بتائیں کہ دینی اعتبار سے یہ جگہ مقدّم ہے یا وہ؟ انھوں نے کہا، ہاں دینی اعتبار سے تو یہی مقدّم ہے۔ چلو اب انتظامات بتاؤ کیا کیا کرنے ہیں۔
>
> نکاح کے روز، خاندان کے بعض افراد نے پائنچا ٹخنوں سے اوپر دیکھا تو کہا؛ ''تھوڑا سا نیچے کرلو۔'' آپ نے مزید اوپر کرلیا، اس بات سے وہ لوگ نہایت متعجّب ہوئے اور ان کو یقین ہوگیا کہ اس شخص میں ایمان ویقین اور اتباعِ شریعت کا غیر معمولی جذبہ کارفرما ہے۔ کی استقامت فی الدّین اور صدق واخلاص ہی کا اثر تھا کہ

خاندان کے افراد بھی رفتہ رفتہ دین کی طرف بڑھنے شروع ہو گئے۔ کئی افراد بعد میں آپ ؒ سے بیعت بھی ہوئے اور بعض مُجاز بھی ہوئے۔ نکاح بہت سادگی سے مسجد ہی میں ہُوا۔'' [۴۲]

مولانا سہیل احمد کی کتاب ''مردِ باصفا'' کو مکتبہ حضرت شاہ زبیر کراچی نے پہلی مرتبہ ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔

''محمد ابوظفر شروانی چشتی قادریؒ سوانح مبارک و کرامات'' کے مصنف صاحب زادہ انعام الرحمٰن شروانی چشتی قادری ہیں، جو ممدوح کے فرزند ہیں۔ اس لیے کتاب میں فراہم کردہ معلومات کو کسی سند کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس سوانح میں صرف حالاتِ زندگی ہی نہیں دیے گئے ہیں بلکہ تصوُّف کے کچھ پہلوؤں کی شرح بھی بیان کی گئی ہے۔ جیسے معجزہ اور کرامات کی تعریف اور ان کا فرق تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ استدراج کی مختصر تعریف بیان کی گئی ہے، جس سے اس کا تصوّر واضح ہو جاتا ہے۔ [۴۳] اسی طرح سماع کے بارے میں بھی مناسب بحث کی گئی ہے۔ سماع کی دلیل میں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے واقعہ اور کشف المحجوب کا حوالہ دیا گیا ہے۔ لیکن اس ضمن میں اس شعر کی درست کتابت نہیں ہو سکی، خواجہ غریب نوازؒ کے خلیفہ کی خواجہ بختیار کاکیؒ پر جس شعر کو سُن کر وجدانی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ درست شعر یوں ہے۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

جب کہ کتاب میں دوسرے مصرعے کے شروع کے دو الفاظ پہلے مصرع میں درج کر دیے گئے ہیں۔ بیعت کے حوالے سے رائج اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ روحانی علوم کے لیے ایک ہی استاد ہونا ضروری ہے۔ جس کی سند میں یہ حدیث بھی پیش کی ہے کہ ''حکمت کو گم شدہ مال سمجھو، جہاں پاؤ اسے اپنا مال سمجھو۔'' مثال میں خواجہ غریب نوازؒ کے بارے میں لکھا کہ انھوں ؒ نے سترہ بزرگان سے فیض حاصل کیا۔ [۴۴] اسی طرح عوام و خواص میں بزرگوں کے عرس ہجری تاریخ میں منانے کا طریقہ رہا ہے۔ اس میں عیسوی تاریخ کے حساب سے منانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں حضرت شاہ حسینؒ لاہوری اور چند بزرگانِ ہندوستان کا نام لیے بغیر ذکر کیا ہے کہ ان کے عرس عیسوی کے مطابق منائے جاتے ہیں۔ راقم کو معلوم ہے کہ کراچی کے ایک بزرگ قلندر بابا اولیاؒ کا عرس ۲۷ جنوری اور راول پنڈی کے ایک بزرگ محمد حسین کا عرس عموماً اکتوبر کے مہینے کی کسی بھی تاریخ کو ہوتا ہے۔ ممدوح کا تعلق چشتی کے ساتھ قادری سلسلے سے بھی ہے۔ اس لیے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مختصر حالات اور چند اقوال بھی سوانح میں تحریر کیے گئے ہیں۔

انعام الرحمان چشتی نے مذکورہ سوانح میں محمد ابوظفر چشتی قادریؒ کے بیش تر اہم حالات پیش کر دیے ہیں جو ایک سوانح میں ضروری ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے ممدوح کی جائے اور سنِ پیدائش، خاندان، تعلیم و تربیت کے مشائخ کا تذکرہ، اولاد، خلفا، حلیہ، خصائل، وصال اور تدفین، قطعہ تاریخِ وصال، کرامات وغیرہ بیان کرنے کے ساتھ، ان ؒ کی

خانقاہ کے معمولات ، خانقاہ کی تعمیری تفصیلات اور پتا، اہم مریدین کا ذکر اور ان کے اسفار کو بھی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اِن معلومات کی پیش کش میں بہتری کی گنجائش محسوس ہوتی ہے۔ جیسا کہ ان کے حلیے اور اولاد کا ذکر وصال کے بعد بیان کیا گیا ہے۔ انھیں آغاز میں تحریر کیا جاتا تو مناسب ہوتا۔ اسی طرح اولاد کے بارے میں تفصیلات نہیں دی گئی حتّا کہ نام بھی نہیں دیے گئے۔ سلسلہ چشت کی وجہ تسمیہ میں تحریر کیا ہے کہ ''اس سلسلے کے یکے بعد دیگرے چار جید بزرگان عظام حضرت خواجہ ابی احمد بن فرسانہ، حضرت خواجہ ابی محمد بن ابی احمد، حضرت خواجہ ابی یوسف اور حضرت خواجہ قطب الحق والدین مودود گزرے ہیں، جن کی بود و باش چشت میں تھی۔''[۴۵] جب کہ تصوُّف کی مستند کتب میں سلسلہ چشت کی وجہ یہ لکھی گئی ہے جب خواجہ ممشاد دینوریؒ کے پاس ابو اسحاق شامیؒ ارادت کے لیے آئے تو انھوں ؒ نے ان سے فرمایا کہ آج سے تم کو چشتی کہا جائے گا، تم خواجہ چشت بنو گے۔ سب سے پہلے جن بزرگ کے ساتھ چشتی نام آیا ہے وہ ابو اسحاق شامیؒ ہی ہیں۔[۴۶]

کتاب کے محرکات کے بارے میں مؤلف انعام الرحمٰن چشتی تحریر فرماتے ہیں۔

> ''اولیأ اللہ (اللہ کے دوست) کی سوانح مبارک اور ان کی کرامات کی تصنیف کا مقصد عوام الناس کو ان پاک باز ہستیوں کے کردار و عمل سے روشناس کرا کر صاحبِ مطالعہ کے دل میں ان بزرگانِ دین کی عظمت، محبت اور انسیت پیدا کرنا اور ان کے دلوں میں اللہ کے ان نیک بندوں کے نقشِ قدم پر گام زن ہونے کی جستجو پیدا کرنا مقصود ہے۔''[۴۷]

اس کتاب کو تحریر کرنے میں احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ غیر مستند اور غیر مصدقہ حالات سے اعراض برتا ہے جو عموماً بزرگوں کے حالاتِ زندگی کے ساتھ نتھی کر دیے جاتے ہیں۔ اس پہلو کا تذکرہ بھی مصنف نے کیا ہے۔[۴۸]

''حضرت خواجہ محمد ابو ظفر شروانی چشتی قادریؒ، سوانح مبارک و کرامات'' کا اسلوب عام فہم ہے کیوں کہ مصنف کا نظریہ ہے کہ ''عام قاری کے دل میں ایسی کتابوں سے دل چسپی پیدا کرنے کے لیے ضخیم کتابوں کے بجائے سبک و سلیس کتب تحریر کی جائیں تا کہ قاری کی مطالعہ میں دل چسپی برقرار رہے۔''[۴۹] زیرِ بحث کتاب اس کی عملی مثال ہے۔ کتاب میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، وہ روز مرّہ زندگی میں مستعمل ہیں۔ بیان میں حد درجے سادگی ہے۔ معلومات کی فراہمی میں بعض مقام پر جملوں کے بڑے ہونے سے اسلوب کی روانی متاثر ہوتی ہے۔ جب کہ واقعات کے بیان میں روانی نمایاں ہے۔ بعض معلومات کی تکرار بھی کتاب میں آ گئی ہے۔ مثلاً اُن کی کتاب ''حقیقتِ بیعت'' کے ترجمے کا تذکرہ ص ۳۳ کے ساتھ، ص ۳۵ پر بھی کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہجرت کا ذکر ص ۲۱ اور ۳۶، اہل چشت کو اہلِ بہشت بھی کہا جاتا ہے، یہ بیان ص ۴۳، ۴۴ اور ۴۷ صفحے پر بھی ہے۔ کئی مقامات پر قرآنی آیات اور احادیث کو تحریر کیا گیا ہے۔ بیش تر مقام پر ان کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ احادیث کے حوالے میں صرف کتاب کے نام پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اردو اور فارسی اشعار کو

بھی جابجا لکھا گیا ہے۔ دوایک مقام پر فارسی اشعار کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ اسلوب کا اندازہ ذیل کی تحریر سے کیا جاسکتا ہے۔

''حضرت قبلہؒ نہایت پرکشش نورانی چہرہ مبارک کے حامل تھے۔ رنگ گورا، دراز قد، چھریرا جسم مبارک، انتہائی وجیہہ وشکیل، چہرہ مبارک پر ہر وقت رعب ونورانیت غالب رہتی۔ دیدہ زیب، صاف ستھرا لباس پسند فرماتے۔ لباس میں سفید رنگ مرغوب تھا۔ کُرتا پاجامہ زیادہ پسند تھا۔ آخری ایام میں کرتا شلوار بھی استعمال فرمائی۔ کہیں تشریف لے جاتے تو شروانی ضرور زیبِ تن فرماتے۔ طبیعت میں حد درجے انکسار تھا، ہر آنے والے کی دل جوئی اور تواضع فرماتے، گفتگو انتہائی نرم لہجے اور منکسر المزاجی سے فرماتے۔ محتاجوں اور مساکین کی حد درجے معاونت فرماتے۔ تمام نمائشی جگہوں پر جانے سے گریز فرماتے لیکن مریض کی عیادت وتعزیت کے لیے ضرور تشریف لے جاتے اور مریض کی اس طرح دل جوئی فرماتے کہ وہ اپنے آپ کو تن درست محسوس کرنے لگتا۔ صاحبِ خانہ کی تواضع قبول فرماتے۔ بعض جگہوں پر اہلِ خانہ کی مجبوری کے پیشِ نظر پانی مانگ کر پی لیتے اور اہلِ خانہ کی تسکین فرمادیتے۔''[۵۰]

صاحب زادہ انعام الرحمٰن شروانی کی کتاب ''حضرت خواجہ محمد ابوظفر شروانی چشتی قادریؒ، سوانح مبارک وکرامات'' کو دسمبر ۲۰۰۵ء میں مکتبہ درگاہ شریف، بابِ ظفر، حسین آباد، حیدرآباد نے شائع کیا۔

سندھ کے خانقاہی ادب میں جو مشائخ چشت سے متعلق جو سوانح تحریر کی گئی ہیں۔ اُن کے محرکات میں تو مماثلت موجود ہے یعنی اپنے شیخ سے محبت وعقیدت کا پہلو، اصلاحی نقطۂ نظر اور اپنے اکابر کے حالاتِ زندگی کو محفوظ کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ البتہ اسلوب میں تنوع پایا جاتا ہے۔ کچھ سوانحوں میں ادبی اسلوب موجود ہے اور کچھ میں عمومی انداز برتا گیا ہے۔ تحقیقی رجحان شاذ شاذ ہی دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ عقیدت کے پیشِ نظر تنقیدی پہلو نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ اُن کی افادیت ہر دور میں رہے گی۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۰۔

۲۔ یونس حسنی، ڈاکٹر، کاوشیں، فرہنگ، میرپورخاص، اشاعت دوم، ۲۰۰۳ء، ص ۴۷۔

۳۔ رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، ص ۱۶۱۔

۴۔ نذیر احمد نیازیؒ، شاہ میرزا، تذکرہ حضرت شاہ آغا محمدؒ، جماعت السالکین، خانقاہ آغائیہ مرتضویہ ٹرسٹ، کراچی، اشاعت دوم، ۲۰۰۴ء، ص ۴۱۔

۵۔ محوّلہ بالا، ص ۱۸۳، ۱۸۴۔

۶۔ محوّلہ بالا،ص۸۹۔

۷۔ محوّلہ بالا،ص۱۳۴،۱۳۵۔

۸۔ شریف الحسن،سید،سیرتِ ذوقی ،مشمولہ ''تربیۃ العشاق''،محفلِ ذوقیہ،کراچی،طبع ششم،۲۰۰۷ء،ص۴۷۲۔

۹۔ ایضًا۔

۱۰۔ محوّلہ بالا،ص۴۶۸،۴۶۹۔

۱۱۔ محوّلہ بالا،ص۴۳۱،۴۳۲۔

۱۲۔ ذہین شاہ تاجی، تاج الاولیا،ادارہ تعلیم وثقافت اسلامی،کراچی،سن ندارد،ص۷۔

۱۳۔ محوّلہ بالا،ص۸۹۔

۱۴۔ محوّلہ بالا،۴۶۷،۴۶۸۔

۱۵۔ محوّلہ بالا،ص۱۳۸،۱۳۹۔

۱۶۔ محوّلہ بالا،۱۲۔

۱۷۔ اکرام حسین سیکری،شاہ، مختصر تذکرہ شاہ ولی محمد،خانقاہ چشتیہ،میرپورخاص،طبع دوم،۲۰۰۲ء،ص ۱۷۔

۱۸۔ محوّلہ بالا،ص۲۳۔

۱۹۔ محوّلہ بالا،۲۳۔

۲۰۔ محوّلہ بالا،ص۲۵۔

۲۱۔ محوّلہ بالا،ص۳،۴۔

۲۲۔ محوّلہ بالا،ص۴،۵۔

۲۳۔ محوّلہ بالا،ص۱۰۔

۲۴۔ محوّلہ بالا،ص۲۹۔

۲۵۔ اکرام حسین چشتی،سید،تذکرۂ امام حسین علیہ السلام ،ادارہ بُستانِ رسول،حیدرآباد،۱۹۷۰ء،ص۱۰۔

۲۶۔ محوّلہ بالا،ص۵۷۔

۲۷۔ رفیع عثمانی،مولانا مفتی محمد،میرے مرشد حضرت عارفی ،ادارۃ المعارف،کراچی،جدید اشاعت، ۲۰۰۲ء،ص۷۹۔

۲۸۔ محوّلہ بالا،ص۵۳۔

۲۹۔ محوّلہ بالا،ص۷۰۔

۳۰۔ محوّلہ بالا،۸۱۔

۳۱۔ محوّلہ بالا،ص۳۔

۳۲۔ محوّلہ بالا،ص۸۰،۸۱۔

۳۳۔ فیاض احمد خان کاوش، پروفیسر، خواجہ غریب نوازؒ ،شرکتِ اسلامیہ، میر پور خاص، اشاعتِ اوّل، ۱۹۹۹ء ،ص۱۲۔

۳۴۔ محوّلہ بالا،ص۳۔

۳۵۔ محوّلہ بالا،ص۵۔

۳۶۔ محوّلہ بالا،ص۱۰۔

۳۷۔ سہیل احمد، مولانا، مرد صفا، مکتبہ حضرت شاہ زبیر، کراچی، اشاعتِ اوّل، ۲۰۰۲ء، ص۹۔

۳۸۔ محوّلہ بالا،ص۱۰۶تا۱۰۹۔

۳۹۔ محوّلہ بالا،۱۱۳تا۱۱۷۔

۴۰۔ محوّلہ بالا،ص ف۔

۴۱۔ محوّلہ بالا،ص ر۔

۴۲۔ محوّلہ بالا،ص۴۰۔

۴۳۔ انعام الرحمٰن شروانی، صاحب زادہ، حضرت خواجہ محمد ابو ظفر شروانی چشتی قادریؒ ،سوانح مبارک و کرامات، مکتبہ درگاہ شریف، بابِ ظفر، حیدر آباد، ۲۰۰۵ء، ص۱۳۰تا۱۳۳۔

۴۴۔ محوّلہ بالا،ص۱۷۔

۴۵۔ محوّلہ بالا،۴۳۔

۴۶۔ خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، مشتاق بک کارنر، لاہور، سن ندارد، ص۱۶۰،۱۶۱۔

۴۷۔ انعام الرحمٰن شروانی، صاحب زادہ، حضرت خواجہ محمد ابو ظفر شروانی چشتی قادریؒ ،سوانح مبارک و کرامات، ص۸۔

۴۸۔ محوّلہ بالا،ص۱۰۔

۴۹۔ ایضًا،

۵۰۔ محوّلہ بالا،ص۱۱۱۔